موجودہ طریقۂ انتخاب کی خرابیاں اور تدابیرِ اصلاح

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

انسان ہمیشہ سے ایک معاشرہ میں زندگی گزارتا رہا ہے۔ معاشرہ میں کسی نہ کسی نوع کی حکمرانی بھی ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ حکمرانی کے لیے صلاح و مشورہ کی ضرورت کا احساس بھی قدیم دور سے چلا آرہا ہے۔ ملکہ سبا کا زمانہ آج سے تین ہزار سال قبل تھا۔ اس کا مقولہ قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے — "میں کبھی کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم لوگوں سے مشورہ نہ کر لوں"— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم دور میں بھی حکمران مشورہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے قدیم تاریخ میں مختلف قوموں کے یہاں مجلسِ شیوخ، پنچائت (VILLAGE MOOT) کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سب حکمرانوں کو مشورہ فراہم کرنے والے ادارے تھے۔

نیک بادشاہ ہو یا مطلق العنان یا جابر و ظالم، صلاح کار اور مشیر سب رکھتے تھے۔ وزیر کا وجود حکمرانی کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ بغداد کو تباہ کرنے والے ہلاکو خاں نے بھی نصیر الدین محقق طوسی کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔

قدیم زمانہ میں وزیر، مشیر اور صلاح کار بننے کے لیے علم، دانائی اور ذہانت کی صفات کا حامل ہونا ضروری تھا۔ ہر سمجھدار بادشاہ عالم اور دانا لوگوں کا گروہ اپنے گرد جمع کرتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے نورتن (نوموتی) ایسے ہی دانا لوگ تھے۔ اکبر بادشاہ کے وزراء میں ایک ہی

خاندان کے دو افراد، ابوالفضل اور فیضی شامل تھے۔

دانائی اور معاملہ فہمی کی صفت کی قدیم زمانہ میں جس قدر اہمیت تھی۔ جدید دور میں اسی قدر ناقدری ہے۔ جدید دور میں علاقائی بنیادوں پر منتخب ہو کر افراد مجلسِ مشاورت میں پہنچتے ہیں اس لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ عالم ہوں، دانا ہوں اور معاملہ فہم ہوں۔ جدید دور نے دانائی اور معاملہ فہمی کے مقابلہ میں علاقائی نمائندگی کو ترجیح دی ہے۔ یہاں مزید یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا علاقائی نمائندہ ایک دانا اور معاملہ فہم سے افضل ہوتا ہے؟ بہترین حکومت کے نقطۂ نظر سے ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ اقبالؒ کا فیصلہ تو اس سلسلہ میں واضح ہے۔

؎ گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

قدیم مشیروں اور صلاح کاروں میں اور جدید نمائندگان میں ایک اہم فرق اور ہے۔ قدیم دور میں حکمران بادشاہ ہوتا تھا۔ صلاح کار وزیر ہوتا تھا۔ مشیروں پر ان کی حیثیت واضح ہوتی تھی کہ وہ وزیر ہی رہیں گے، بادشاہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے بڑی حد تک وہ اغراض سے بلند ہو کر حکمران کو صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جدید دور میں علاقائی نمائندہ صرف مشیر ہی نہیں ہوتا، بلکہ تشکیلِ حکومت میں شریک اور حصہ دار بن سکتا ہے۔ یہ لالچ اس کی سوچ کو، اس کے طرزِ عمل کو متاثر کرتا ہے۔ وہ بے لاگ مشورہ دینے کے بجائے وزیرِ اعلیٰ یا وزیرِ اعظم کی ہاں میں ہاں ملانے کو ترجیح دیتا ہے۔ تملق اور خوشامد کا بازار ماضی میں ہی گرم نہیں رہتا تھا۔ جدید دور میں بھی گرم رہتا ہے۔

انتخاب کا موجودہ طریقہ ساری دنیا میں انگلستان سے اخذ کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے انگلستان کی پارلیمان کو مادرِ پارلیمان کہا جاتا ہے۔ انگلستان کی پہلی دستوری دستاویز میگنا کارٹا (MAGNA CHARTA - 1215) میں یہ اصول طے کیا گیا:

NO TAXATION WITHOUT REPRESENTATION

"علاقائی نمائندگان سے مشورہ کیے بغیر بادشاہ کو محصول لگانے کا حق نہیں ہے۔"

یہاں سے علاقائی نمائندگی کا اُصول تسلیم کیا گیا۔ اور پھر پارلیمان کی تشکیل علاقائی نمائندگان سے کی گئی۔ مگر یہ سب مختلف علاقوں کے امراء اور نواب ہوتے تھے۔ جو وراثتی انداز میں ممبر بنتے تھے۔ ہندوستان کی دولت سے صنعتی انقلاب برپا ہونے اور مُلک میں بڑے بڑے کارخانے لگ جانے کے بعد معاشرہ کی روایتی تشکیل میں خلل واقع ہو گیا۔ امراء اور نوابین کی اہمیت کمتر ہو گئی۔ اور تاجروں اور سرمایہ داروں کی اہمیت بڑھ گئی۔ محصولات کے نقطۂ نظر سے ظاہر ہے بھی دوسرے طبقہ کی اہمیت زیادہ ہے۔ تاجر اور سرمایہ دار وراثتی نواب نہیں تھے۔ بہ نو تبدیل ہوتے رہتے تھے، اس لیے ان کے انتخاب کے لیے رائے کا ذریعہ استعمال کیا گیا۔ برطانوی پارلیمان میں انتخابات پہلے امراء اور نوابین کے نقطۂ نظر سے ہوتے تھے، بعد میں سرمایہ داروں اور تاجروں کے نقطۂ نظر سے ہونے لگے۔ ذہین، عالم اور معاملہ فہم کی صفات جو عالمِ مشرق میں درکار تھیں وہ برطانیہ میں اول روز سے مقصود نہیں تھیں۔ پھر عوام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸۳۲ء میں پہلی مرتبہ عوام کی بالغ رائے دہی کی جانب اہم قدم اُٹھایا گیا۔ رائے دہندہ پر کوئی مالی شرائط عاید کی گئی تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں پہلی مرتبہ بالغ رائے دہی کا حق تسلیم کیا گیا۔ انگلستان دُنیا کا پہلا مُلک تھا، جس میں بالغ رائے دہی کا طریقہ رائج ہوا۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت نے ۱۸۸۲ء میں علاقائی نیابت کے اُصول کو رائج کیا۔ رائے دہندہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ پانچ ہزار کی مالیت کا حامل ہو۔ جب کہ ہندوستان میں فی کس آمدنی چھ پائی تھی، پانچ ہزار آمدنی والے رائے دہندگان بہت کم تھے۔ آج ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ بالغ رائے دہی کا اُصول رائج ہے۔

علاقائی نیابت کے اُصول میں یہ بات مضمر ہے کہ منتخب وہ شخص ہو، جو اس علاقہ میں صاحبِ اثر ہو۔ غالباً قانون سازوں کے ذہن میں "صاحب اثر" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس علاقہ میں نیک نام ہو، اچھی شہرت کا مالک ہو، عزت و وقار کا مستحق ہو۔ ان وجوہ کی بناء پر علاقہ میں ہر دلعزیز ہو اور مقبول ہو۔ مگر عملاً صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ منتخب ایسا شخص ہوتا ہے جو دولت مند ہوتا ہے۔ اور اپنے انتخاب کے سلسلہ میں رائے دہندگان پر روپیہ خرچ کرتا ہے۔ وقتی طور پر ان کو خوش کر دے۔ وقتی طور پر رقوم دے کر ان کو خرید لے۔ بعض وہ لوگ ہوتے

ہیں جو اپنی قوت اور طاقت سے عوام کو ڈرا دھمکا کر ووٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ عموماً علاقے کے زمیندار اور وڈیرے ہوتے ہیں۔ پولیس کا جن کے ساتھ گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔

یہ وہ بات ہے جو اس طریقۂ انتخاب کو رائج کرنیوالوں اور قانون سازوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ مگر اب سب لوگ بے بس نظر آتے ہیں۔ اور سب نے اس بدترین طریقہ کو گوارا کر لیا ہے۔

دوسری بڑی خرابی کی جڑ یہ علاقائی نیابت کا اصول ہے۔ علاقہ نیابت میں اوّلین اہمیت علاقے کے لوگوں کو مطمئن کرنا ہے۔ ان کی فلاح و بہبود کو اوّلین اہمیت دینا ہے۔ اس طرح علاقے کی بنیاد پر منتخب ممبران کی سوچ علاقائی، وقتی اور ہنگامی ہو جاتی ہے۔ وہ ملکی، اصولی اور اخلاقی معاملات کو اہم نہیں سمجھتے۔ اس فرق کو ہم اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک لڑکا جب کہتا ہے کہ میں پتنگ اڑاؤں تو اُس کی سوچ وقتی اور ہنگامی ہے، باپ جب کہتا ہے کہ تعلیم حاصل کر تو اُس کی سوچ اصولی اور دُور رس ہے۔ اب اگر زندگی کے معاملات میں علاقائی اور ہنگامی سوچ کا غلبہ ہو جائے تو معاملات ضرور خراب اور ابتر ہو جائیں گے۔ علاقائی نیابت کا طریقہ علاقائیت، تنگ دلی کو پروان چڑھاتا ہے۔ اور ملکی اور اصولی معاملات کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

علاقائی نیابت کا ایک خراب نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجلس مشاورت میں اعلیٰ افکار، اعلیٰ قابلیت کا کوئی شخص شامل نہیں ہو سکتا۔ علاقائی اور ہنگامی کاموں کے سامنے اس کے اعلیٰ افکار، اس کی اصولی باتیں عوام کو اپیل نہیں کرتیں۔ لہٰذا بسا اوقات ایک تماشا باز کے مقابلہ میں ایک اعلیٰ کردار و افکار کا شخص ناکام ہو جاتا ہے۔ اور اب تو کھلاڑی اور اداکار سیاست میں آ رہے ہیں۔ ان کی مقبولیت کے مقابلے میں کوئی بھی دوسرا شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیا فی الواقع وہ اداکاری اور کھیل کی مقبولیت تھی، جو قانون سازوں کے پیش نظر تھی۔ اس طرح نیابتی طریقہ انتخاب میں ارکان کی علمی، اخلاقی، کرداری سطح پر بھی بتدریج نیچے گرتی رہتی ہے۔ اسمبلی میں وہ لوگ پہنچتے ہیں، جن کا علم محدود، جن کی نظر کوتاہ، جن کا مبلغ علم ناقص ہوتا ہے۔

کسی ملک کی یہ بدبختی ہو گی کہ قومی قیادت بونوں پر مشتمل ہو، ایک بھی ان میں بلند قامت

دیوزاد نہ ہو۔ ممکن ہے کہ آرام سے چلتی گاڑی کو تو چلا لے جائیں، لیکن اگر موڑ آگیا، چڑھائی آگئی یا تصادم ہو گیا تو ایسے لوگ گاڑی نہ چلا سکیں گے۔ مسلمانوں کی قومی قیادت جس نے بیک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑی، انگریزوں کے خلاف اور ہندوؤں کے خلاف، وہ دیو قامت لوگ تھے۔ سرسید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح وہ لوگ علم و عمل کی صلاحیتوں اور استعدادوں کے لحاظ سے منفرد اور یگانہ قسم کے لوگ تھے۔

ممبران جب اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں تو پوری کوشش کرتے ہیں کہ وزراء کے گروہ میں شامل ہوں۔ وزراء چند ہی ہو سکتے ہیں اور ممبران ہوتے ہیں کئی سو کی تعداد میں۔ ظاہر ہے کہ ان کے درمیان مسابقت ہوتی ہے، سازشیں ہوتی ہیں۔ چغل خوریاں ہوتی ہیں۔ وزیر اگر نہ بن سکا تو وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی طاقتور وزیر کے گروہ میں شامل ہو جائے اور آئندہ کے لیے زمین ہموار کرے۔ ان حالات میں بہت کم ممبر ایسے ہوں گے جو اس دوڑ دھوپ سے علیحدہ رہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو کھلم کھلا حزبِ اختلاف میں شامل ہوں۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ جو لوگ اس قسم کی سخت ویز میں شریک ہوں، کیا وہ غیر جانب دار اور صحیح مشورہ دے سکتے ہیں۔

اور اگر کبھی کسی جانب سے صائب اور مفید مشورہ پیش بھی کیا جائے تو پارٹی ڈسپلن کی چھڑی پارٹی کے اندر بولنے والوں کو خاموش کر دینے کے لیے کافی ہے۔ پارٹی کے باہر سے اگر صائب مشورہ آئے تو پارٹی کو ان کا مشورہ ماننا آتا ہے۔ تقسیم سے قبل سندھ میں کانگریس کی حکومت تھی۔ انہوں نے بندش شراب کا بل پیش کیا تو مسلم لیگ کے مسلمان ممبروں نے جماعتی عصبیت کی وجہ سے اس کی مخالفت کی اور قرآن کے احکام کی بھی پروا نہیں کی۔

غرض کہ علاقائی نمائندگی کے اصول نے جمہوریت کی گاڑی کا رخ علاقائیت، عصبیت، تنگ نظری اور کم علمی اور بے اصولی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہر نئے انتخاب کے بعد جمہوریت کی گاڑی اس راہ پر دو چار قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے۔

حکمرانی میں شرکت کے لالچ نے قومی مشیروں کو مشورہ دینے کی صلاحیت اور منصفانہ کردار سے محروم کر دیا ہے۔ آج کے دور میں پارلیمان درحقیقت جوڑ توڑ کا اڈہ ہے۔ شطرنج کی بساط پر چالاک شاطر اپنی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دینی اور ملی مقاصد، اخلاق و کردار

کے تقاضے، ملکی مفاد سب ذاتی اغراض کی قربان گاہ پہ مذبوح رہتے ہیں۔
اس نوع کے قومی مقاصد کا تذکرہ کرنے پر سامع کی جانب سے عموماً یہ جملہ سننے کو ملتا ہے

"نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے"

یہ جملہ برف کی ایک سِل ہے جو نوخیز اُبھرتے ہوئے مُصلح کے دل و دماغ پر آکر گرتی ہے۔ اور یخ بستہ کر دیتی ہے۔ وہ بے قرار رُوح منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ آیئے پہلے اس جملہ کا تجزیہ کیجیے۔

پہلے ایک مسلمان کی حیثیت سے سوچیے۔ حق کی آواز ہمیشہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہوتی ہے۔ سارے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نقار خانوں میں صدا لگاتے رہے۔ ظلمت کدوں میں دیئے جلاتے رہے۔ کامیابی و ناکامی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم ان نبیوں کے پیروکار ہیں ہمیں بھی یہ آواز بلند کرنا چاہیے۔ اور یہ دیئے روشن کرنے چاہئیں۔ نہ نقاروں سے گھبرانا چاہیے، نہ ظلمتوں سے ڈرنا چاہیے۔

ایک اور جملہ ہے جو ایسے موقع پر سامع کی جانب سے سننے کو ملتا ہے۔

"اکیلا چنا کیا بھاڑ پھونک سکتا ہے" — یہ جملہ بھی یاس و قنوطیت کا مظہر ہے۔ یہ جملہ غلط ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ پھونکے نہ پھونکے مگر ایک فرد کام کر گزرتا ہے۔ قوم کو بیدار کر ڈالتا ہے۔ تنِ مُردہ میں زندگی کی رُوح دوڑا دیتا ہے۔ جدید مغربی علوم کی اشاعت کے لیے ایک فرد سر سید احمد خان نے کمر ہمت باندھی اور اپنے زمانہ کا مخالفانہ رویّہ ختم کر دیا۔ آج جو مغربی علوم کی بہار آئی ہوئی ہے وہ ایک ہی باہمت فرد کی لائی ہوئی ہے۔ آزاد خطۂ زمین پاکستان کا تصور ایک فلسفی شاعر نے پیش کیا تھا۔ ایک صاحبِ عزیمت رہنما قائد اعظم محمد علی جناح نے اس تصور کو حقیقت کی شکل دینے کا بیڑا اُٹھایا اور بالآخر پاکستان آج دُنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ کیا یہ سب ایک ایک فرد کے کارنامے نہیں ہیں۔ صاحبِ عزیمت انسان اور صاحبِ عزیمت قوم سب کچھ کر سکتی ہے۔ ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔

بلاشبہ ایک بیج کو درخت بننے میں اور درخت کو پھل دینے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے مسلسل اور پیہم محنت کے ساتھ طویل صبر اور انتظار کی ضرورت ہوتی ہے اور

عجلت پسند انسان ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اِدھر وہ بیج پھینکے اور اُدھر پھل لگنے لگے۔ دراصل خرابی کا مرکز اس کا اپنا ذہن ہے۔ اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔
بہر کیف ملک و ملت کے ہمدرد اور بہی خواہ افراد کا فرض ہے کہ وہ قومی اور ملکی مسائل پر مسلسل غور و خوض کرتے رہیں، حالات کا تجزیہ کرتے رہیں۔ مسائل کا حل اور خرابیوں کا علاج سوچتے رہیں۔ اور پھر اپنے نتائجِ افکار کو قوم کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ مسلسل پیش کرتے رہیں تا آنکہ چشمِ نابینا بینا ہو جائے۔ اور گوشِ گوش شنوا بن جائے۔ خاص طور پر یہ فریضہ ملت کے اہلِ علم اور اہلِ فکر افراد پر عاید ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ومن لم یھتم بامور المسلمین فلیس منا۔ — جو شخص مسلمانوں کے معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی جذبہ کے تحت ذیل میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ اربابِ علم اور اربابِ اقتدار شاید انہیں درخورِ اعتنا سمجھیں۔

۱ — قومی اسمبلی کی اصل حیثیت مجلسِ مشاورت کی ہے۔ اس حیثیت کو اولیت دی جائے۔ قومی، ملکی اور ملی مسائل اور مفادات پر آزادانہ گفتگو کی جائے۔ ضابطہ کی پابندیوں سے بولنے والوں کا گلا نہ گھونٹا جائے۔ صدرِ مجلس کی حیثیت وزیرِ اعظم سے ہرگز فروتر نہ ہو۔

۲ — علاقائیت کے مقابلہ میں مشاورت کو اہمیت دی جائے۔ معاملہ فہم اور پیش بین افراد کو اسمبلی میں لانا چاہیے جیسے علماء، پروفیسر، وکلاء جو اپنے ماحول میں نیک ہوں۔

۳ — اسمبلی کا ممبر بننے کے لیے چالیس سال عمر کی شرط ہونا چاہیے۔ اس عمر میں جذباتیت کم ہو جاتی ہے۔ اور معاملہ فہمی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور عورت کے لیے ۶۰ سال کی شرط ہونی چاہیے۔ اس عمر میں وہ خانگی امور سے بے نیاز ہو کر ملکی اور ملی مسائل پر توجہ دے سکتی ہے۔

۴ — علاقائی نمائندگی کے مقابلے میں اسمبلی میں ایک تعداد ایسے افراد کی ضرور ہونی چاہیے۔

جو کل کی نمائندگی کریں۔ صوبائی اسمبلی میں کل صوبے کے نمائندے ہوں اور قومی اسمبلی میں کل ملک کے نمائندے ہوں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جہاں دوسرے لوگ علاقائی مفاد کی باتیں کریں، وہاں ایک تعداد ایسی بھی ہو جو پورے صوبے اور پورے ملک کے مفادات کی باتیں کریں۔ جو ملکی مفادات اور اصولی و اخلاقی تقاضے پیش کریں۔ یہ لوگ کس طرح اسمبلی میں پہنچیں، اس کے لیے طریقۂ کار سوچنا چاہیے۔

۵ ــــ علاقائیت کا رجحان کم کرنے کے لیے ایک تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ صوبائی انتخابات میں صرف اس پارٹی کو شرکت کی اجازت ہو جس کی شاخیں صوبہ کے تمام اضلاع میں سرگرمِ عمل ہوں، وہ ایک صوبائی جماعت ہو۔ اسی طرح قومی انتخابات میں صرف اس جماعت کو شرکت کا موقع دیا جائے جس کی شاخیں ملک کے تمام صوبوں میں قائم ہوں۔ وہ ایک قومی جماعت ہو۔ اس طرح قومی سوچ اُبھرے گی۔ اور علاقائی تنگ دلی کم ہوگی۔

۶ ــــ حکومت چلانے کے لیے مضبوط اور مستحکم پارٹی چاہیے۔ اور اکثریت کی حامل ہونی چاہیے۔ اگر پہلے انتخاب میں واضح اکثریت حاصل نہ ہو تو پھر دوبارہ انتخابات کرانے چاہئیں تاکہ واضح اکثریت حاصل ہو۔

۷ ــــ اور یہ بات تو سب سے زیادہ اہم ہے کہ اگر ملک و قوم کو تباہ کرنا نہیں چاہتے تو براہ مہربانی دھونس دھاندلی، سازش، حکومت کا دباؤ جیسے عوارضات کو ختم کرو۔ آزادانہ جمہوری روایات کو کام کرنے کا موقع دو۔

یہ اور اسی قسم کی تجاویز کے حق میں رائے عام کو بیدار کرنا قوم کے بہی خواہوں اور اہلِ فکر لوگوں کا کام ہے۔